سبق: 11

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ یوسف، آیت 94 تا 104)

وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ اِنِّىۡ لَاَجِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ لَوۡلَاۤ اَنۡ تُفَنِّدُوۡنِ ﴿۹۴﴾

اور جب قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا اگر تم میری عقل کو کمزور نہ سمجھو تو مجھے یقیناً یوسف کی خوشبو آرہی ہے ﴿94﴾

آیت 94 ﴿ وَلَمَّا فَصَلَتِ الۡعِيۡرُ قَالَ اَبُوۡهُمۡ . . . : یوسف علیہ السلام کا جو بھائی پیچھے رہ گیا تھا اور جس نے کہا تھا کہ میں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ یا تو وہ مجھے آنے کی اجازت دے یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دے، تو رب تعالیٰ نے وہ فیصلہ کر دیا اور سارا راز کھول دیا۔ برادرانِ یوسف کو معلوم ہو گیا کہ مصر کے تخت پر بیٹھنے والا عزیز ان کا بھائی یوسف علیہ السلام ہے۔ اس کے بعد جب انھوں نے اہل و عیال کے ہمراہ مصر آنے کی دعوت دی تو یہ قافلہ بخوشی یوسف (علیہ السلام) کی قمیص لے کر

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾

انھوں نے کہا اللہ کی قسم بے شک آپ اپنی اسی پرانی بھول میں ہیں ﴿95﴾

وہاں سے چل پڑا۔ جب یہ قافلہ مصر سے نکلا تو یعقوب علیہ السلام اپنے گھر والوں سے کہتے ہیں: ﴿اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ ''اگر تم میری عقل کو کمزور نہ سمجھو تو مجھے یقیناً یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔'' ''تُفَنِّدُوْنِ'' کا معنی ہے کہ حواس کام نہیں کر رہے، عقل صحیح کام نہیں کر رہی اور بڑھاپے اور غم کی وجہ سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ بندہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ اگر تم یہ نہ سمجھو اور میری بات مانو تو آج مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

آیت 95 ﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ﴾: یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر اہل خانہ کہتے ہیں کہ آپ پرانی بھول میں ہیں اور آپ کو اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا تھا۔ آپ ہر وقت یہی امید لگائے رہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے اور آپ کو ضرور ملے گا، حالاں کہ یہ بات بہت پرانی ہوچکی ہے۔ یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے کہ یوسف علیہ السلام کی قمیص مصر سے لائی جارہی ہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خوشبو آگئی ہے۔ بعض لوگ اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ نبی عالم الغیب ہوتا ہے اور اس کے پاس یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اتنی دور سے کسی بات کو معلوم کر لیتا ہے تو یہ باتیں درست نہیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں معجزات سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔ مصر تو بہت دور ہے جس کنویں میں یوسف علیہ السلام کو پھینکا گیا وہ اس بستی کے قریب ہی تھا لیکن وہاں سے کوئی خوشبو نہیں آئی۔ اگر یعقوب علیہ السلام عالم الغیب ہوتے تو پہلے دن ہی بیٹوں سے کہہ دیتے کہ تم کہتے ہو کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے جبکہ تم تو اسے کنویں میں پھینک کر آئے ہو اور پھر یعقوب علیہ السلام جلدی سے جاتے اور یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر لے آتے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا انھیں کسی چیز کے متعلق علم نہیں ہوا۔

یوسف علیہ السلام کن مراحل سے گزرے باپ کو کچھ پتا نہیں ہے۔ بھائی کس ارادے سے یوسف علیہ السلام کو لے کر جارہے ہیں اور ان کا آپس میں کیا مشورہ ہوا ہے اس کے بارے میں بھی یعقوب علیہ السلام کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ سارا مشورہ بھی انھوں نے گھر میں رہ کر یا قریب ہی کسی جگہ کیا ہوگا لیکن یعقوب علیہ السلام کو پتا نہیں چل سکا کہ میرے بیٹے اپنے ہی بھائی کو کنویں میں پھینکنے جارہے ہیں۔ ان کی طرف سے دھوکا دینے پر خدشہ ضرور ظاہر کیا گیا تھا لیکن اگر انھیں اصل بات کا علم ہوتا تو وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ نہ بھیجتے۔ اس لیے یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں کہ یعقوب علیہ السلام بھی چونکہ نبی ہیں، لہٰذا رب تعالیٰ نے جس وقت چاہا معجزے کے طور پر ان تک یوسف علیہ السلام کی خوشبو پہنچا دی۔ یہ صحیح عقیدہ ہے اور اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور اہم بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معجزہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔

احادیث میں یہ بات موجود ہے کہ خندق اور احزاب کے موقع پر کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خندق کھودی گئی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ بھوک کی وجہ سے ساتھ لگا ہوا دیکھا، میں واپس بیوی کے پاس گیا اور میں نے کہا: کیا تمھارے پاس (کھانے کو) کوئی چیز ہے؟ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت بھوک لگی ہوئی ہے۔ وہ میرے پاس ایک تھیلا لائی جس میں ایک صاع جو تھے اور ہماری ایک پالتو پٹھوری تھی میں نے اسے ذبح کر دیا، بیوی نے جَو پیس دیے اور میرے (گوشت بنانے سے) فارغ ہونے تک وہ بھی فارغ ہو گئی۔ میں نے گوشت کاٹ کر ہانڈی میں ڈال دیا، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے لگا تو وہ کہنے لگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ والے لوگوں کو لا کر مجھے شرمندہ نہ کرنا، میں نے آپ کے پاس جا کر چپکے سے بات کی، میں نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نے اپنی چھوٹی سی پٹھوری ذبح کی ہے اور ہم نے گھر میں موجود جَو کا ایک صاع پیسا ہے، آپ اور آپ کے ساتھ کچھ آدمی آ جائیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونچی آواز کے ساتھ اعلان کر دیا: ''خندق والو! جابر نے دعوت تیار کی ہے اس لیے سب آ جاؤ۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تک میں نہ آؤں اپنی ہانڈی نہ اتارنا اور آٹے کی روٹی نہ پکانا۔'' میں گھر آیا اور لوگوں کے آگے آگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آ گئے، حتیٰ کہ میں اپنی بیوی کے پاس آ گیا، اس نے کہا: اللہ تیرے ساتھ ایسا اور ایسا کرے۔ میں نے کہا: تم نے جو کہا تھا میں نے ویسے ہی کیا، خیر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گندھا ہوا آٹا نکالا، آپ نے اس میں لعاب مبارک ڈالا اور برکت کی دعا کی، پھر ہماری ہانڈی کی طرف متوجہ ہوئے، اس میں لعاب ڈالا اور برکت کی دعا کی، پھر فرمایا: ''ایک روٹی پکانے والی بلا لو وہ تمھارے ساتھ روٹیاں پکاتی رہے اور اپنی ہانڈی سے سالن ڈالتے جاؤ اور اسے چولہے سے مت اتارو۔'' صحابہ ایک ہزار تھے، میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ انھوں نے کھایا حتیٰ کہ چھوڑ دیا اور واپس چلے گئے اور ہماری ہانڈی اسی طرح اُبل رہی تھی جیسے پہلے تھی اور ہمارے آٹے سے اسی طرح روٹیاں پک رہی تھیں جیسے وہ پہلے تھا۔ [صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غزوة الخندق : ٤١٠٢]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کی بنیاد پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ کلام اللہ میں بہت طاقت ہے، لہٰذا برکت کے لیے کھانے پر قرآن پڑھ کر اس میں لعاب ڈالا جا سکتا ہے تو یہ درست بات نہیں ہے۔ یہ معجزہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔ آج کسی شخص کی طرف سے کھانے میں لعاب ڈالنے سے اس طرح برکت نہیں پڑے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کا کمال دیکھیں کہ مسلمان خندق کھود رہے ہیں اور شکایات آ رہی ہیں کہ خندق نہیں کھودی جا رہی اور ہم نے تو کئی دن سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم نے (جنگِ خندق کے دوران) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور اپنے پیٹوں سے کپڑا اٹھایا جن پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو اس

فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِيۡرُ اَلۡقٰىهُ عَلٰى وَجۡهِهٖ فَارۡتَدَّ بَصِيۡرًا‌ ۚ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّـكُمۡ ‌ۚۙ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾

پھر جب خوش خبری دینے والا آ پہنچا تو اس نے ان کے چہرے پر وہ (قمیص) ڈال دی تو فوراً ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں، کہنے لگے کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿96﴾

پر (بھوک کی وجہ سے) دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ [سنن الترمذي، أبواب الزهد، باب ما جاء في معيشة أصحاب النبي ﷺ : ۲۳۷۱، حسنه زبير علي زئي] اللہ کے رسول ﷺ نے اس وقت کسی سے یہ نہیں کہا کہ اتنے دن بھوکا رہنے کا کیا فائدہ ہے، تم کھانا پکاؤ میں اس میں برکت ڈال دیتا ہوں اور سارے کھا لیتے ہیں۔ یعنی معجزہ نبی کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جب اور جیسے چاہتا ہے اپنے نبی کے ہاتھ سے معجزے کا اظہار کروا دیتا ہے۔ یہ عقیدے کی بات ہے جسے توجہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیت 96 ﴿ فَلَمَّاۤ اَنۡ جَآءَ الۡبَشِيۡرُ اَلۡقٰىهُ عَلٰى وَجۡهِهٖ . . . . : بعض لوگ اس آیت سے علم غیب کی دلیل نکالتے ہیں کہ دیکھا یعقوب علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، حالاں کہ بات وہی ہے کہ اس سے پہلے انھیں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن جب ساری بات کھل گئی تو اللہ رب العالمین نے یہ چیزیں واضح کر دیں۔ اللہ رب العزت بیان فرما رہے ہیں کہ خوش خبری دینے والا قمیص لے کر آ گیا ہے، یا تو یوسف علیہ السلام نے اپنا کوئی نمائندہ قمیص دے کر بھیجا ہو گا یا وہ بڑا بیٹا جو پریشان تھا کہ میں گھر کیسے جاؤں گا، اسے ہی قمیص دے کر بھیج دیا۔ اس سلسلہ میں بہت ساری روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن قرآن نے یہ چیز بیان نہیں کی، اس لیے یہ بات سمجھ لیں کہ جس کسی کو بھی یوسف علیہ السلام نے قمیص دے کر بھیجا وہ "الۡبَشِيۡرُ" یعنی خوش خبری دینے والا تھا۔ بہر حال جب یہ سارے بھائی آ گئے اور قمیص کو یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا تو "فَارۡتَدَّ بَصِيۡرًا" ان کی نظر لوٹ آئی۔ وہ ہر چیز صاف دیکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کی بینائی ٹھیک کر دی۔ یہ یوسف علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ قمیص بھیجنے والے یوسف علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور جن کی آنکھوں کا علاج ہوا ہے وہ بھی اللہ کے نبی ہیں۔ معجزہ اللہ کے نبی کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے بھی رب تعالیٰ غیر معمولی چیزوں کا اظہار کروا دیتے ہیں، ایسا کوئی معاملہ غیر نبی کے ساتھ ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں لیکن ہوتی یہ بھی اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ اس میں کسی بزرگ کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّـكُمۡ ۚۙ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ : یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کیا میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ خواب ہے جو یوسف علیہ السلام

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ

انھوں نے کہا اے ہمارے ابا جان! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کیجیے، بے شک ہم ہی خطا کار تھے (97) کہا

نے دیکھا اور باپ کو بتایا تھا۔ باپ کو امید تھی کہ یہ خواب ضرور پورا ہو کر رہے گا، اسی لیے یعقوب علیہ السلام اس کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ میں تم سے کہتا نہیں تھا کہ یوسف زندہ ہے اور وہ ہم سے ضرور ملے گا، لیکن تم میری اس بات کو مانتے نہیں تھے۔ ان کا اشارہ اس خواب کی طرف ہے جو یوسف علیہ السلام نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ یوسف کنویں میں تھا اور اسے وہاں سے نکال کر مصر پہنچا دیا گیا ہے، ایسی کوئی چیز یا اشارہ کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ بات صرف یہی ہے کہ یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر سمجھ گئے تھے، اسی لیے وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ وہ وقت ہر صورت لے کر آئے گا جب یوسف کے ساتھ ان کی ملاقات ہو گی۔

آیت 97، 98 ﴿ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ . . . . ﴾: یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی، انھیں ساری حقیقت معلوم ہو گئی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی مل گیا کہ اب ہم نے یوسف علیہ السلام کے پاس مصر جانا ہے تو پھر بھائی مل کر باپ سے معافیاں مانگنے لگے کہ آپ ہمارے لیے اللہ سے بخشش طلب کیجیے۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ساری غلطی ہماری ہے۔ ہم نے بہت بڑا ظلم کیا کہ یوسف کو دھوکے سے لے جا کر کنویں میں پھینک دیا تھا۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بندے سے بڑے سے بڑا گناہ ہو جائے، اس کا حل رب تعالیٰ سے معافی مانگنا اور بخشش طلب کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بڑا گناہ ہو گیا تو سمجھا جائے کہ اب اس کی معافی نہیں ہو گی۔ خلوصِ نیت کے ساتھ شرک سے توبہ کی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی معاف فرما دیتا ہے حالاں کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ شرک سے معافی مانگنے کے بعد پھر اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہی رہنا چاہیے۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہوتی ہے کہ بندہ گناہ کرنے کے بعد اپنی غلطی کو دل سے تسلیم کرے اور اپنے رب کی بارگاہ میں سربسجود ہو جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) [صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب تعديل النساء بعضهن بعضا: ٢٦٦١] ''بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔''

اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿ وَ الَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓىِٕكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٦٨ تا ٧٠] ''اور وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے اور نہ ہی اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق قتل کرتے

رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا، بے شک وہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿98﴾

ہیں اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو ایسا کرے گا وہ سخت سزا پائے گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ ذلیل ہو کر اس میں پڑا رہے گا۔ مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔“

ان آیات میں تین بڑے گناہوں کا ذکر ہے، پہلا شرک ہے جو کہ اکبر الکبائر ہے، دوسرا بڑا گناہ قتل ہے اور تیسرا زنا ہے۔ ان تینوں گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ جو کوئی توبہ کرنے کے بعد اپنی اصلاح کر لے، اپنے رویے تبدیل کرے اور عمل صالح اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں بندہ سمجھے کہ اب اس کی معافی نہیں ہے۔ موت کے آثار نمودار ہونے اور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک سب انسانوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) [صحيح مسلم، كتاب الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه : ۲۷۰۳] ”جس شخص نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لے گا۔“

ایک اور روایت میں ہے، معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ، وَلَا تَنْقَطِعُ التَّوْبَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا)) [سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في الهجرة هل انقطعت : ۲۴۷۹، صحيح عند الألباني] ”ہجرت ختم نہیں ہوسکتی حتی کہ توبہ منقطع ہو جائے اور توبہ اس وقت تک منقطع نہیں ہو گی حتی کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔“ گویا ہر مسئلہ میں استغفار کرنا اور توبہ کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ . . . . : یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے سبھی بہت خوش تھے اور اس خوشی میں اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ بیٹوں کو غلطی کا احساس ہے تو باپ بھی کہہ رہا ہے کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا، اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ اس میں ہمارے لیے سبق ہے کہ جب کبھی کوئی خوشی ملے تو خالقِ کائنات کی طرف رجوع سب سے زیادہ ہونا چاہیے اور اس موقع پر بھی اپنی غلطیوں کو پیش کر کے استغفار کرنا چاہیے۔ بسا اوقات لوگ خوشی کے موقع پر بھی ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ یہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ حقیقی خوشی کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ عاجزی اختیار کی جائے اور معافی مانگی جائے۔

مفسرین نے یہاں یہ بحث بھی کی ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں عنقریب اپنے رب سے تمھارے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔ ''سَوْفَ'' کا معنی تاخیر ہوتا ہے کہ کچھ دیر ٹھہر کر کروں گا۔ مفسرین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام درحقیقت دیکھنا چاہتے تھے کہ یوسف علیہ السلام جن کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوا ہے انھوں نے معاف کیا ہے یا نہیں۔ ان کا اپنے بھائیوں کے ساتھ رویہ کیسا ہے اور وہ ان کے لیے کوئی سزا تو تجویز نہیں کرتے؟ اسی طرح دوسری بات یہ کہ یعقوب (علیہ السلام) کے ساتھ بھی بہت بڑی زیادتی ہوئی تھی کہ بیٹوں کے اس ظلم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور ان کی بینائی جاتی رہی، اس لیے باپ کے دل میں ناراضی کا ہونا بھی فطری امر تھا، لہٰذا انھوں نے فوراً معافی طلب کرنے کی بجائے وعدہ کیا تھا کہ میں اللہ سے ضرور معافی مانگوں گا جو کہ یقیناً انھوں نے پورا کیا ہوگا۔ یہ ساری باتیں ممکن ہوسکتی ہیں، البتہ سیاقِ کلام سے یہی بات ظاہر ہو رہی ہے کہ انھوں نے محض تاخیر کرنے کے لیے یہ بات نہیں کی تھی بلکہ کہا تھا کہ میں تمھارے لیے مغفرت ضرور طلب کروں گا۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں جمعرات کو معافی مانگوں گا۔ اسی طرح یہ بھی بیان ہوا ہے کہ انھوں نے کہا تھا جمعہ کی رات بڑی مقرب ہوتی ہے، میں اس وقت بخشش طلب کروں گا لیکن یہ باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہیں۔ ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہیں۔ اولاد کو اپنے ماں باپ سے دعائیں لینی چاہییں اور والدین کو بھی ہر حال میں اپنی دعاؤں میں اپنی اولاد کو شامل رکھنا چاہیے۔

الادب المفرد میں ہے کہ ایک شخص نے کسی معشوقہ عورت کو قتل کر دیا، پھر اسے ندامت ہوئی وہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا کہ اور کہا توبہ کی کوئی صورت ہو تو بتائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: کیا تیری والدہ زندہ ہے؟ اس شخص نے کہا: نہیں۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ توبہ کر اور جس قدر ہو سکے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کر (ہوسکتا ہے اللہ تیرا گناہ بخش دے) عطاء بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ آپ نے اس کی ماں کے زندہ ہونے کا کیوں پوچھا تو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ((إِنِّي لَا أَعْلَمُ عَمَلًا أَقْرَبَ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ بِرِّ الْوَالِدَةِ)) [الأدب المفرد: ٤] ''میں والدہ کے ساتھ نیکی کرنے سے زیادہ اللہ کے قریب کرنے والا کوئی عمل نہیں جانتا۔''

آج والدین ذرا سی بات پر ناراض ہو کر بد دعائیں دینا شروع کر دیتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی دعا اللہ کے ہاں کس قدر مقبول ہے، لہٰذا ہر ممکن طریقہ سے اپنی اولادوں کے لیے دعا اور استغفار کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے، تاکہ والدین کی دعاؤں سے اولاد ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے اور اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ والدین کی خدمت کرے اور دعائیں لے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

پس جب وہ یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ مصر میں داخل ہو جاؤ، اگر اللہ نے چاہا تو امن کے ساتھ رہو گے ﴿۹۹﴾

آیت 99 ﴿ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ . . . : یعقوب علیہ السلام اپنے اہل خانہ کے ہمراہ کنعان سے مصر پہنچے تو معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے مصاحبین کے ہمراہ شہر سے باہر نکل کر والدین اور دوسرے اہل خانہ کا شان دار استقبال کیا۔ آیت کے الفاظ " ادْخُلُوْا مِصْرَ " (مصر میں داخل ہو جاؤ) سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام قافلے کے استقبال کے لیے شہر کے باہر موجود تھے۔ مفسرین نے یعقوب علیہ السلام اور اہل خانہ کے وہاں پہنچنے کے حوالے سے مختلف روایات بیان کی ہیں، لیکن جو بات واضح سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خاندان کے دیگر افراد کو ٹھہرانے کے لیے الگ سے اچھی جگہ دی جبکہ والد اور والدہ دونوں کو اپنے ساتھ ٹھہرایا، جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا تھا کہ یوسف علیہ السلام نے باقی بھائیوں کو دوسرے خیموں میں ٹھہرایا جبکہ سب سے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے جگہ دی۔

والدین کو اپنے ساتھ ٹھہرانا زیادہ عزت افزائی والی بات ہے اور پھر یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر یقیناً بہت زیادہ تیاری کی ہو گی۔ " اَبَوَيْهِ " سے مراد ماں باپ ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی والدہ چھوٹے بھائی کی ولادت کے وقت وفات پا گئی تھیں اور یہ ان کی خالہ تھیں جن کے ساتھ بعد میں یعقوب علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا۔ اس کے لیے دلیل کے طور پر اسرائیلی روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن اہل علم کے ہاں ان کا اعتبار نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آزر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا باپ نہیں تھا، حالاں کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ ﴾ [الأنعام: ۷۴] مذکورہ آیت میں ابراہیم علیہ السلام آزر کو اپنا باپ کہہ رہے ہیں۔ جب قرآن باپ کہہ رہا ہے تو اس کے برعکس روایات جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس آیت میں بھی اگر " اَبَوَيْهِ " کہا گیا ہے جو کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے بولا جاتا ہے تو خالہ مراد لینے کی کیا ضرورت ہے۔

بعض مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جگہ جگہ اسرائیلی روایات کو نقل کیا ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان چیزوں کو پیش کرنے کی بجائے دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پورے قصہ میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی، ہدایت، دعوت اور تربیت کے لیے کیا اسباق بیان کیے ہیں اور کن چیزوں کو نمایاں کیا ہے۔ محض دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اس واقعہ سے متعلق جس قسم کی بے بنیاد باتیں پھیلائی جاتی اور بیان کی جاتی ہیں یہ درست نہیں ہے۔ یوسف علیہ السلام اپنے والدین

وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ

اور انھوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ سب ان کے لیے سجدے میں گر گئے اور انھوں نے کہا اے میرے ابا جان! یہ ہے میرے اس خواب کی تعبیر جو میں نے پہلے دیکھا تھا، یقیناً میرے رب نے اسے سچا کر دکھایا اور یقیناً اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا، جب مجھے جیل سے نکالا اور اس وقت بھی جب وہ آپ سب کو دیہات

اور خاندان کے دیگر لوگوں کو مصر میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں تو ساتھ ہی کہتے ہیں: ﴿ اٰمِنِيْنَ ﴾ یعنی یہاں آپ کو بھوک، قحط اور دشمن کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہو گا اور آپ یہاں نہایت امن وسکون سے رہیں گے، البتہ یہ امن میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ﴾ کہ اگر اللہ نے چاہا تو امن میں رہیں گے۔

آیت 100 ﴿ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ: یعقوب علیہ السلام اور خاندان کے دیگر افراد بھرپور استقبال کے بعد جب مصر پہنچ گئے اور وہاں مجلس سجی تو یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اونچی اور نمایاں جگہ پر بٹھایا جو کہ یقیناً ان کا حق تھا جبکہ باقی سب نیچے بیٹھ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجلس میں یہ چیز جائز ہے کہ جس کا احترام زیادہ کرنا ہو اس کی کرسی اونچی ہوسکتی ہے، یا اسے اونچی جگہ پر بٹھانے کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ یہ غلط نہیں ہے۔ بعض صوفیاء اگرچہ ان چیزوں کو نہیں مانتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا جواز رکھا ہے۔ یوسف علیہ السلام ایک نبی کی حیثیت سے ماں باپ کا استقبال کر رہے ہیں اور انھیں اونچا درجہ دے رہے ہیں۔ والدین کا حق یقیناً بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اولاد پر فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو عزت و احترام سے نوازے۔ لیکن اپنے ایمان کی حفاظت اور عجب، خود پسندی اور ریا کاری سے بچنے کے لیے اس طرح نمایاں جگہ پر بیٹھنے سے پرہیز کرنا چاہیے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ((اِتَّقُوْا هٰذِهِ الْمَذَابِحَ)) [المعجم الكبير للطبراني: ۱۳/ ۵٤۰، ح: ۱٤٤۳۳] ''ان مذابح سے بچو۔'' امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے ''مذابح'' سے مراد صدور المجالس لیا ہے، یعنی صدارتی کرسی۔ مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو مجالس کی صدارتی جگہوں سے بچاؤ اور اس کام کے لیے کوشش مت کرو۔ ہاں اگر کسی کو عزت کی وجہ سے بٹھا دیا جائے تو وہ الگ بات ہے البتہ کسی کے دل میں اس کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔

وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا: ماں باپ اور بھائیوں سمیت مجلس میں موجود سب لوگوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا جو کہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا اور بادشاہوں وغیرہ کے لیے اس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو یہ بھی سجدہ تعظیمی تھا۔ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سجدہ تعظیمی کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جبکہ عبادت کا سجدہ تو کبھی بھی

بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ

سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان اختلاف کھڑا کر دیا تھا، بے شک میرا رب

غیر اللہ کے لیے روا اور جائز نہیں رہا۔عبادت کا سجدہ صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ شریعت رب تعالیٰ کے حکم کا نام ہے، جب وہ ذات باری تعالیٰ خود کسی کو سجدہ کرنے کا کہہ دے تو پھر اس حکم کو پورا کرنا عبادت ہے۔ ایسی صورتِ حال میں عبادت اللہ کی ہو گی اور تعظیم اس شخص کی ہو گی، لیکن یہ چیز پہلی امتوں کے لیے تھی۔ اب اگر کوئی سجدہ تعظیمی کے لیے کہے تو اس کی بات پر عمل نہیں کیا جائے گا۔بعض لوگوں نے اس حوالے سے تاویل کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ سجدہ وہ نہیں تھا جو نماز کے اندر کیا جاتا ہے اور جس میں انسان اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے بلکہ یہ سجدہ اس قسم کا تھا کہ سب نے یوسف علیہ السلام کو جھک کر سلام کیا تھا، جیسا کہ آج کل ہمارے معاشروں میں بھی جھک کر سلام کرنے کا طریقہ رائج ہے لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔قرآن مجید کے الفاظ اس چیز کو بالکل بھی قبول نہیں کرتے۔ آیت میں صاف کہا گیا ہے: ﴿ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ﴾ ''وہ سب ان کے لیے سجدے میں گر گئے۔'' جب بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ تعظیمی کو پہلی امتوں کے لیے جائز رکھا تھا تو اس میں پریشانی کا اظہار کرنے اور تاویل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ اس امت کا اعزاز ہے کہ اس میں تعظیمی سجدہ بھی جائز نہیں ہے۔قرآن مجید کا انداز بہت سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا: ﴿ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ﴾ [البقرۃ : ۳۴] ''آدم کو سجدہ کرو۔'' اب اس کی یہاں یہ تاویل کی جائے کہ فرشتوں نے جھک کر سلام کیا تھا تو یہ انتہائی غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ تاویلیں کرنے سے نقصانات ہی ہوتے ہیں۔

وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ . . . : جب سارے سجدے میں گر پڑے تو یوسف علیہ السلام اپنے باپ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے اے ابا جان! یہ اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے آپ کو بتایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میرا خواب سچا ثابت کر دیا۔ میں نے یہی کچھ خواب میں دیکھا اور آپ کو بتایا تھا۔ ثابت ہوا کہ خواب پورا ہوتے ہوئے دسیوں سال بھی لگ سکتے ہیں۔

وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ . . . : یوسف علیہ السلام اللہ رب العزت کی طرف سے احسانات کا تذکرہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی قید کا ذکر کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے ابا جان! مجھے میرے رب نے قید خانے سے نکالا۔مصر کی عورتوں نے میرے خلاف سازش کی، عزیزِ مصر کی بیوی خاص طور پر اس معاملے میں پیش پیش تھی اور دوسرے سارے بھی مجھے قید کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کے ساتھ مجھ پر احسان کیا

لِمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۰۰﴾

باریک بینی سے جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔ بے شک وہی خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰۰﴾

اور مجھے رہائی دلوائی۔ اگر رب تعالیٰ نہ چاہتے تو میں کسی صورت رہا نہیں ہو سکتا تھا۔ اللہ رب العالمین نے دوسرا احسان مجھ پر یہ کیا کہ آپ کو فلسطین سے مصر میں میرے پاس لے آیا۔ میں نے آپ کو یہاں عزت، وقار اور قدر و منزلت سے نوازا ہے تو یہ آپ کا حق ہے اور یہ سب کچھ رب تعالیٰ کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے۔

یہاں ایک بہت خوب صورت نکتہ بیان ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام یہ بات کہہ سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ مجھے کنویں سے نکالا، یعنی وہ اپنی بات کا آغاز یہاں سے کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ بھی تو رب تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا لیکن وہ سب سے پہلے قید خانے سے نکلنے کی بات کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ بھائیوں کے سامنے کنویں سے نکالے جانے کی بات کرتے تو لازمی طور پر بھائی شرمندہ ہوتے، لہٰذا خوشی کے اس موقع پر انھوں نے والدین اور بھائیوں کے سامنے یہ بات نہیں کی اور انھیں شرمندگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ یوسف علیہ السلام اللہ رب العالمین کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آپ کا فلسطین سے مصر آنا میرا یا میری حکومت کا کمال نہیں ہے اور نہ ہی میری طرف سے قحط کے دوران غلہ بھیجنے سے یہ سب کچھ ہوا ہے بلکہ یہ سب اللہ کا احسان ہے۔ یوسف علیہ السلام کی طرف سے بولے گئے ایک ایک جملے میں بہت بڑی دعوت اور تربیت ہے۔

مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّيۡطٰنُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَ اِخۡوَتِىۡ : یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ اے ابا جان! میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جو معاملہ پیش آیا اس میں ساری شرارت شیطان کی تھی۔ ظاہر ہے یہ معاملہ والدین اور بھائیوں کے ذہن میں بھی تھا لیکن یوسف علیہ السلام شیطان کی بات کر کے بھائیوں کا دفاع کر رہے ہیں اور ان کی عزتِ نفس کا پورا خیال رکھ رہے ہیں۔ مسلمان گناہ گار ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سود کی ستر قسمیں ہیں، ان میں سے سب سے کم تر سود کا گناہ اتنا ہے جیسا کہ ایک شخص اپنی والدہ کے ساتھ بدکاری کرے اور یقیناً سب سے بڑا سود اور زیادتی کسی مسلمان کی عزت کے بارے میں زبان درازی کرنا ہے۔ [المعجم الأوسط للطبراني : ۷/ ۱۵۸، ح : ۷۱۵۱۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱۸۷۱] حقیقت ہے کہ امت کے لوگوں کی اگر اس انداز میں تربیت ہو جائے تو انھیں درپیش بہت سارے مسائل حل ہو جائیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ غصے پر ضبط اور کنٹرول کرنے کا یہ رویہ اختیار ہی نہیں کیا جاتا اور ذرا سی بات پر لوگ انتقام اور بدلہ لینے پر اتر آتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا رویہ یہ تھا کہ انھوں نے بھائیوں کو قصور وار نہیں ٹھہرایا بلکہ شیطان کی طرف نسبت کر کے ان کی صفائی

رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡكِ وَ عَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ

اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے حکومت عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی، اے آسمانوں اور زمین کے

پیش کر رہے ہیں۔ اس سے لگتا ہے یوسف علیہ السلام کے دل میں ہو گا کہ اباجان بھائیوں سے ناراض ہوں گے کہ تم نے ہی یہ سارا ظلم کیا ہے، اس لیے وہ ان کا غصہ ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ اپنے بیٹوں سے ناراض نہ ہو۔ جن لوگوں نے دعوتِ دین کا کام کرنا ہو ان میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے۔ ایسے لوگوں کو پھر اللہ تعالیٰ بلند مقام عطا کر دے تو اس سے دعوت کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ۔ ۔ ۔ : ''بے شک میرا رب باریک بینی سے جو چاہتا ہے کر دکھاتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے اتنی خوب صورت اور شان دار تدبیر کی کہ شیطان کے سارے منصوبے ناکام بنا کر مجھے اس مقام سے نواز دیا کہ آپ سب کو میرے پاس لے آیا ہے۔ فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ﴾ ''بے شک وہی خوب جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

آیت 101 ﴿ رَبِّ قَدۡ اٰتَیۡتَنِیۡ مِنَ الۡمُلۡكِ : یوسف علیہ السلام اللہ کی نعمتوں اور اس کے انعامات کا ذکر کر کے شکر کے کلمات ادا کر رہے ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جب رب تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملے تو انسان کو اس کا تذکرہ کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اپنے خالق اور مالک کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔ یوسف علیہ السلام یہی کہہ رہے ہیں کہ اے میرے رب! تو نے مجھے ملک عطا فرمایا۔ ''مِنَ الۡمُلۡكِ'' میں ''مِنۡ'' کا لفظ بعض کے معنی میں ہے کہ ملک کا کچھ حصہ۔ ظاہر ہے مصر ایک خطے اور علاقے کا نام ہے، اصل بادشاہی تو اللہ رب العالمین کی ہے۔ ہر چیز اسی کے قبضے میں ہے۔ انسان کے پاس ہمیشہ تھوڑی چیز ہوتی ہے، اسی لیے یوسف علیہ السلام ''مِنَ الۡمُلۡكِ'' کہہ کر اس بات کو واضح کر رہے ہیں کہ اے اللہ! حقیقی بادشاہی تیری ہی ہے، مجھے تو تُو نے ملک اور حکومت کا حصہ عطا کیا ہے، لیکن اسے میں تیرا بہت بڑا انعام سمجھتا ہوں۔

وَ عَلَّمۡتَنِیۡ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ : اے اللہ! تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھایا ہے، یہ تیرا بہت بڑا انعام ہے۔ اس آیت میں دو نعمتوں، ایک ملک کا ملنا اور دوسرے علم کے ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے کسی کو حکومت عطا فرما دے اور وہ وسائل کا صحیح استعمال کر کے دنیا کو فائدہ پہنچائے تو یہ اس ذات باری تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اس لیے اگر دنیا میں کسی جگہ مسلمانوں کی اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو سمجھ لیں کہ رب تعالیٰ نے وہاں کے لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ حکومت کی طرح علم کی بھی بہت اہمیت ہے۔ یوسف علیہ السلام اسی کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے یہ حکومت عطا فرمائی، ایسے ہی مجھے علم بھی عطا فرمایا ہے۔

وَ الْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ

پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے، مجھے فرماں بردار بنا کر فوت کر اور مجھے نیک لوگوں

علم کی فضیلت بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر جو فضیلت اور برتری دی اس کی بنیاد علم ہی ہے، فرمایا: ﴿ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ﴾ [البقرۃ: ۳۱] ''(اللہ نے) آدم (علیہ السلام) کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔'' اس کا مطلب ہے کہ علم انسان کی فضیلت میں بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ '' مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ '' کے دو معنی کیے گئے ہیں: ایک یہ ہے کہ جو باتیں سامنے آئیں ان کو سمجھنے میں بڑا تیز فہم ہو، یا ان باتوں سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کمال بصیرت رکھتا ہو۔ اس لیے یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ تو نے مجھے یہ نبوت کا علم عطا فرمایا جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہوتا، یا پھر اس کا مطلب خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ دونوں تفسیریں اس سے مراد ہو سکتی ہیں۔ '' مِنْ '' کا مطلب یہی ہے کہ ضروری نہیں سارا علم اس میں آ گیا ہے بلکہ علم میں سے کچھ حصہ مجھے ملا ہے۔ جس طرح پیچھے یہ بات بیان ہوئی ہے کہ مجھے ملک میں سے کچھ حصہ دیا گیا، ایسے ہی علم میں سے کچھ حصہ عطا کیا گیا ہے۔ حقیقی علم تو اللہ رب العالمین کے پاس ہی ہے۔ وہ جسے جتنا چاہتا ہے اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بھی یہ بات نہیں کی کہ اے اللہ! تو نے مجھے سارا علم دے دیا ہے بلکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ جتنا علم تو نے مجھے دیا ہے اسے میں تیرا انعام سمجھ کر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ : ''اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے۔'' میں خوابوں کی تعبیر بیان کر رہا ہوں، خزانے کا نظام سنبھال رہا ہوں، یا ملک کے دیگر معاملات چلا رہا ہوں تو اس میں تو ہی میرا ساتھی اور میرا کارساز ہے۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں تیری مدد کے ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ گویا انسان کے دل میں کبھی بھی تکبر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیشہ عاجزی اور انکساری کا رویہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ : '' مجھے فرماں بردار بنا کر فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔'' اے اللہ! دنیا میں تو نے حکومت عطا کر دی، علم کی نعمت سے نواز دیا اور دوسری بہت ساری چیزیں دے دیں، اب میری ساری توجہ اپنی آخرت کی طرف ہے۔ حقیقت ہے کہ ہر ایمان والے کو اسی بات کی فکر ہونی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی امت کی یہی رہنمائی کی اور اس حوالے سے یہ دعا سکھائی ہے: ((إِذَا أَرَدْتَ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ)) [سنن الترمذي، أبواب تفسير القرآن، باب ومن سورۃ ص: ۳۲۳۵] ''جب تو کسی قوم کو آزمائش میں

بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

کے ساتھ ملا دے ﴿101﴾

ڈالنا چاہے تو مجھے آزمائش میں ڈالے بغیر موت دے دے۔'' اقتدار اور حکومتیں انسانوں کو اس سوچ و فکر سے بہت دور لے جاتی ہیں، بہت سارے لوگوں کے ذہن برباد ہو جاتے ہیں، وہ تکبر کرنے لگتے ہیں اور عیاشیوں میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب پر ہمارا حکم چلتا ہے اور سارے ہمارے تابع ہیں۔ عام طور پر حکومتوں میں موجود زیادہ تر لوگوں کا حال یہی ہوتا ہے، لیکن یوسف علیہ السلام اللہ سے ڈر رہے ہیں اور دعائیں کر رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اسلام اور فرماں برداری کی حالت میں موت دینا اور تیرے وہ پسندیدہ لوگ جنھیں تو نے جنت عطا کرنی ہے میرا حشر ان لوگوں کے ساتھ کرنا۔ یہ دعا بہت بڑی دعوت ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں علم اور حکومت کی نعمت سے نوازے اور عزت، فضیلت اور مقام و مرتبہ عطا فرمائے انھیں خاص طور پر یہ دعا ضرور کرنی چاہیے۔

عقل مند بندہ وہ ہے جو دنیا کی نعمتوں میں گم نہ ہو۔ یوں تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں آخرت یاد ہے لیکن یہ آیت بتا رہی ہے کہ آخرت کو حقیقت میں وہی یاد رکھتا ہے جو موت کو یاد کرتا ہے۔ ایمان والوں کی ہمیشہ یہ دعا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم پکے مسلمان ہوں اور دنیا میں ہمارے ذمے جو کام ہیں انھیں بخوبی انجام دینے کے بعد یہاں سے رخصت ہوں۔ کوئی کام ہم سے رہ نہ جائے اور ہماری اطاعت اور فرماں برداری میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہے۔ اللہ رب العالمین فرماتے ہیں: ﴿ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِيْقًا ﴾ [النساء: ٦٩] ''جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے رفیق ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، وہ (انعام یافتہ) انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور نیک لوگ ہیں اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔'' یہ آیت بہت بڑی دعوت ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ علم کی دولت، حکومت اور وسائل سے نوازے ان کی ذمہ داریاں یقیناً زیادہ ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کو اپنی آخرت کی فکر بھی زیادہ ہونی چاہیے اور انھیں دعائیں بھی بہت کرنی چاہییں کہ یا اللہ! ہمیں فرماں بردار رکھنا اور حشر میں انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء کا ساتھ نصیب فرمانا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں آپ کو گلے کی سخت تکلیف ہوگئی تو میں نے آپ سے سنا آپ فرما رہے تھے: ((مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ)) [صحیح البخاري، کتاب تفسیر القرآن، باب: ﴿فأولئك مع الذين ... ﴾: ٤٥٨٦] ''(مجھے) ان لوگوں کے ساتھ (ملنا ہے) جن پر اللہ نے انعام کیا، وہ (انعام یافتہ) انبیاء ہیں اور صدیقین ہیں اور شہداء ہیں اور نیک لوگ ہیں۔''

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے فیصلے پر متفق ہوئے تھے اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے (102)

آیت 102 ﴿ ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ : یوسف علیہ السلام کے قصہ کا اختتام ہو رہا ہے۔ سورت کے آخر تک اس واقعہ سے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو دعوت پیش کرنا چاہتے ہیں اب اسے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ پھر یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ رب تعالیٰ نے یہ سارا واقعہ آپ کو وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ اس سے پہلے آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ "وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ" اور نہ ہی آپ ان کے پاس موجود تھے۔ آپ نے یہ واقعہ کہیں سے پڑھا بھی نہیں ہے۔ سچی اور صحیح بات وہی ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے اپنے نبی کو بتائی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے طور پر اس واقعہ کے حوالے سے جتنی باتیں بنائی ہوئی ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہاں اس بات کی دعوت دی جا رہی ہے کہ اصل علم وحی کا علم ہے اور اتباع اسی کی ہے۔ وحی کے ذریعے جو باتیں بیان نہیں کی گئیں انھیں تسلیم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی انھیں شریعت سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و صداقت پر ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے ہیں اور اہلِ مکہ کو خبردار کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ اگر آپ سچے پیغمبر نہ ہوتے تو ہزاروں سال پہلے کے واقعات آپ کو کیسے معلوم ہو سکتے تھے اور پھر یہ واقعات وہ تمھارے سامنے کس طرح بیان کر سکتے تھے۔

وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ : "اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے فیصلے پر متفق ہوئے تھے اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔" یعنی جب برادرانِ یوسف نے مل کر فیصلہ کیا تھا کہ یوسف (علیہ السلام) کو کنویں میں پھینک دیا جائے اور وہ اپنے باپ سے جا کر کیا باتیں کر رہے تھے، اے نبی! آپ کو اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت آپ وہاں تھے۔ یہ باتیں آپ کو اب بتائی جا رہی ہیں۔ یہ ساری باتیں اہل مکہ کے لیے، یا ان سارے لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے نہیں تھے، بہت بڑی دعوت ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے سامنے پلے بڑھے ہیں، ان کا کوئی استاد نہیں اور نہ ہی آپ کسی سے پڑھے ہیں، لیکن اس کے باوجود سارا واقعہ انھوں نے تفصیل کے ساتھ تمھارے سامنے بیان کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ساری باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک وحی کے ذریعے پہنچائی گئی ہیں، لہٰذا اب تمھیں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لے آنا چاہیے اور آپ پر نازل کردہ علم کو قبول کر لینا چاہیے۔ یہ

وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۰۳﴾

اور آپ خواہ کتنا ہی چاہیں، ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ﴿103﴾

دعوت اس دور میں اہل مکہ کے لیے تھی جبکہ آج ساری دنیا کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ آپ ﷺ کے ساتھ قائم کیا تھا، جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دین مکمل ہو چکا ہے، اب سب کے لیے دعوت یہی ہے کہ وہ اس دین کو سچے دل سے تسلیم کریں۔ اسی میں ان کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

آیت 103 ﴿وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ﴾: اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ تو اس بات پر بہت حریص ہیں کہ سبھی لوگ ایمان لے آئیں لیکن آپ کتنا بھی چاہیں یہ سارے لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، اس لیے آپ فکرمند اور پریشان نہ ہوں۔ ہم نے یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ وحی کے ذریعے سے آپ تک پہنچا دیا، آپ نے بھی اسے اسی طرح لوگوں کے سامنے بیان کر دیا۔ اب چاہیے تو یہ کہ وہ اس پر ایمان لائیں، لیکن تھوڑے لوگ ہوں گے جو ان باتوں کو تسلیم کریں گے۔ اکثر لوگ وہی ہیں جو انکار کے لیے کوئی اور چیز گھڑ کر لے آئیں گے۔ نبی اکرم ﷺ یقیناً اس بات پر بہت غم زدہ ہوئے کہ مشرکین مکہ سارے دلائل سننے کے بعد بھی دین کی دعوت قبول نہیں کر رہے۔ سابقہ قوموں کا حال بھی یہی رہا کہ ان کے اکثر لوگ ماننے والے نہیں تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی دعوتِ دین کے لیے محنتوں و کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے حوصلہ دے رہے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی، لیکن جن کی قسمت میں ایمان لانا نہ ہو وہ کبھی حق کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ داعی حضرات کو دیکھنا چاہیے کہ میں نے لوگوں کی اصلاح کرنے، سمجھانے اور دعوت پیش کرنے میں کسی کمزوری کا مظاہرہ تو نہیں کیا اور دعوت پیش کرنے کے لیے میرے پاس جو وسائل ہیں انھیں میں پوری طرح استعمال کر رہا ہوں یا نہیں۔ ماننا یا نہ ماننا اور نتیجہ تو اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے لیے کامیابی اور ناکامی کا معیار یہ نہیں ہے کہ کس کے ساتھ لوگ کتنے زیادہ ہیں، کون سی جماعت کے پاس طاقت زیادہ ہے اور پذیرائی کسے زیادہ مل رہی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ وحی کے ذریعے نازل ہونے والے دین کی دعوت پر قائم ہیں یا نہیں۔ حق وہی ہے جو آسمانوں سے وحی کے صورت میں آیا ہے۔ داعی کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کی پیش کردہ دعوت کے طریقے میں کوئی کمزوری ہے تو اس کی اصلاح کی جائے۔ جہاں تک ہدایت ملنے یا نہ ملنے کی بات ہے تو یہ اللہ کے قبضے میں ہے۔ کتنے لوگ مانیں گے اور کتنے انکار کریں گے، اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اکثریت ہمیشہ انکار کرنے اور مخالفت کرنے والوں کی رہی ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے نبیوں کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ نبی ﷺ کے ابتدائی دور میں بھی یہی کیفیت تھی لیکن پھر نبی اکرم ﷺ کے آخری دور میں ایسا ہوا کہ

وَ مَا تَسۡـَٔلُهُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾ ع ١١/١١ ٥

حالانکہ آپ ان سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتے، یہ تو صرف تمام جہانوں کے لیے ایک بڑی نصیحت ہے ﴿104﴾

﴿ يَدۡخُلُوۡنَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ﴾ [النصر : ٢] لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے، رب تعالیٰ چاہیں گے تو اب بھی ایسا ہو جائے گا۔ دعوت کے ساتھ ساتھ جہاد ہو گا تو اللہ تعالیٰ زیادہ راستے کھولے گا، توفیق سے نوازے گا اور لوگ دین کی طرف آئیں گے۔

داعی حضرات کی کوشش ہمیشہ یہی ہونی چاہیے کہ انھیں کام کرنے کے مواقع زیادہ ملیں، دشمنانِ اسلام دین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے جو تدبیریں کر رہے ہیں انھیں ناکام بنایا جائے اور دعوت کے راستے بند نہ ہونے دیے جائیں۔ آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ دشمن قوتیں اسلام کی راہ روکنے کے لیے کبھی دھمکی آمیز رویے اختیار کرتی ہیں تو کبھی بین الاقوامی سطح پر قانون سازیاں کی جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کی کوشش ہونی چاہیے کہ وہ کتاب و سنت پر باہم متحد ہوں، ان کے آپس میں رابطے مضبوط ہوں اور اللہ تعالیٰ انھیں کام کرنے کے مواقع عطا فرمائے۔ سیاست کے میدان میں بھی سوچ یہی ہونی چاہیے کہ دعوت اور خدمت کے کام کو کس طریقے سے زیادہ سے زیادہ بہتر بنانا ہے اور دین کی دعوت کس طرح مزید مضبوط ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ لے کر آپ آگے بڑھیں گے تو رب تعالیٰ کی تائید حاصل ہو گی اور اللہ کے فضل و کرم سے آپ کا کام بھی بہتر ہوتا جائے گا۔

یہ مسلم معاشروں میں کرنے والے کام کی بات ہو رہی ہے، جہاں تک کافر قوتوں کا معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ جب مسلمانوں کو قوت عطا کرتا ہے تو ان میں سے بھی بہت سارے لوگ دعوت تسلیم کرنے لگتے ہیں۔ تبوک میں رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی دی تو شام کے ساتھ جتنی صلیبی ریاستیں تھیں سب نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اعلان کیا کہ ہم مدینہ کے تابع ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس موقع پر انھیں ایک تحریر لکھ کر دی، جس میں ان کے لیے امان لکھ دی۔ [دیکھیے دلائل النبوۃ للبیہقي : ٥/ ٢٤٧، ٢٤٨] جزیہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسلام کی برتری کو قبول کر لیا ہے۔ اس چیز سے مسلمانوں کو دعوت کے رستے ملتے ہیں اور جہاد کی راہ میں کھڑی کی گئی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی سیاست کا ایک بہت بڑا مقصد دین کی دعوت کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانا ہے۔

آیت 104 ﴿ وَ مَا تَسۡـَٔلُهُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ : ﴾ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ کوئی بات کر رہے ہیں تو اس میں آپ کا اپنا مفاد ہوتا ہے لیکن اللہ رب العزت فرما رہے ہیں کہ اے نبی! آپ تو ان سے کسی قسم کی کوئی اجرت نہیں مانگتے اور آپ کو ان سے کسی قسم کا کوئی مفاد نہیں ہے۔ آپ تو صرف دین کی دعوت پیش کر کے ان کی آخرت سنوارنا چاہتے ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور وہ ان پر توجہ ہی نہیں کرتے ﴿105﴾

بعض لوگ نہ ماننے کے لیے ان چیزوں کو بھی بہانہ بناتے ہیں کہ فلاں شخص کا چونکہ اپنا مفاد ہے، اس لیے وہ یہ بات کر رہا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے انکار کرنے والوں کے لیے کسی بہانے کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: یہ تو نصیحت ہے، جو مانے گا اس کا فائدہ ہے اور جو نہیں مانے گا اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔ ہمارا کام تو سب تک دعوت پہنچا دینا ہے۔ ''لِّلْعٰلَمِيْنَ'' کا مطلب ہے کہ یہ دعوت اور نصیحت صرف مکہ والوں کے لیے ہی نہیں قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ دینِ اسلام کی یہ دعوت تمام براعظموں تک پھیلنے والی ہے۔ جو لوگ نہیں مانتے نہ مانیں، ان کے نہ ماننے سے دین کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دیتے ہوئے استقامت کا درس دے رہے ہیں۔ سب مسلمانوں کے لیے یہی دعوت ہے اور اسی پر ان کی تربیت ہونی چاہیے۔